

گہوارہ ادب

امریکہ

کی جانب سے مجلہ ”سفیر“ کا دوسرا شمارہ آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ حق و سچ کی اس سفارت میں ہم کس حد تک کامیاب ہوئے یہ تو آپ ہی بتا سکتے ہیں۔ ہم نے حق و سچ کے پیغام کو آپ تک پہنچانے کے لئے ”سفیر“ کی مستقل بنیادوں پر اشاعت کا فیصلہ کیا ہے۔ اگر آپ ایک قلم کار ہیں اور حق و سچ کی اس جدوجہد میں اپنا کردار ادا کرنا چاہتے ہیں تو دیر مت کیجئے اور اپنی تحریریں و نگارشات ہم تک ارسال کریں۔

فیکس نمبر : 5058-643 (501) 1

ای میل ایڈرس: feedbackmqm@mailcity.com

رابطہ فون :

شکیل صدیقی --- 973-375-5591 خورشیدالحق --- 718-939-3537

روحیل خان --- 631-281-5351

میرے لہجے میں میرے عہد کی سچائی ہے
میری آواز سے آواز ملائے رکھنا

أُمُورِ سَفَارَتِ

سرپرست	-----	ڈاکٹر خالد مقبول صدیقی
نگران	-----	عباد الرحمن ایڈوکیٹ
مدیران اعلیٰ	-----	عمران حسین
مدیران	-----	احمد نکلیل صدیقی ، خورشیدالحق

☆ ————— معاونین ————— ☆

عطیہ نیازی ، شازیہ ارشاد ، سیدہ نفیس حسن
راشد خان ، تنویر اسلم ، تقی کمال ، طلعت اشاعت

ایم کیو ایم امریکہ

بابِ سفیر

۵ پیغامِ سفیر ----- سینٹرل آرگنائزر امریکہ -----

۶ خیالِ سفیر ----- ادارہ -----

فکرِ سفیر

۸ تحریکِ آزادی سے آزادی۔ ایک نظر میں۔۔۔۔۔ امین حیدر -----

۱۱ خدشات و خطرات۔۔۔ انسانی ارتقاء میں مائل رکاوٹیں۔۔۔ خورشیدالحق -----

۱۳ Revolution of Roses ----- شازیہ ارشاد -----

۱۵ مال ----- حارث شمسی -----

۱۷ ایک سچی کہانی ----- فواد قاضی -----

۱۹ آزادی کے خواہشمند ----- عمران حسین -----

فکرِ سفیر

۲۱ ----- سیدہ نفیس حسن ----- مختاری کی مجبوری

۲۵ ----- شکیل صدیقی ----- منطقی انجام

نوائے سروش

۱۰ ----- طلعت اشارت ----- اپنے دیار کی باتیں

۱۲ ----- عطیہ نیازی ----- غزل

۱۳ ----- شازیہ ارشاد ----- اب بھی نہ مانیں گے تو کب مانیں گے

۱۶ ----- تقی کمال ----- غزل

۲۰ ----- جنید فہمی ----- انوکھا دل

۲۳ ----- طلعت اشارت ----- ارضِ وفا

پیغامِ سفیر

نئے سال کی آمد آمد ہے۔۔۔۔ اس نئے سال کی آمد پر ہمارا عزم ہے کہ۔۔۔۔ ہم اس نئے سال میں امیدیں جگائیں۔۔۔۔ سیاہ راتوں کو صبح نورہائیں۔۔۔۔ آج قربان کر کے۔۔۔۔ اپنے کل کو سجائیں گے۔ کوئی ستم۔۔۔۔ کوئی جبر۔۔۔۔ ہمارے سفر کی تیزی نہ کر سکے گا کم۔۔۔۔ خوشی کے راستوں پر اب نہ رہے گا کوئی غم۔۔۔۔ یہ ہمارا عزم ہے۔۔۔۔ ہمارا مضبوط ارادہ ہے۔۔۔۔ ہماری گردنیں نہ ہونگی خم۔۔۔۔ عزم سے چمکتی آنکھیں اب نہ ملیں گی نم۔

اب بھی وہی راہیں ہیں۔۔۔۔ وہی منزل کا شوق ہے۔۔۔۔ بس تبدیلی ہے سال کی۔۔۔۔ لیکن نئے سال کا سورج بھی ہمارے ارادوں کو تبدیل نہ کر سکے گا۔

پاکستان سے امریکہ تک فاصلے بہت صحیح۔۔۔۔ لیکن سفر ایک ہے اور سفیر بھی۔۔۔۔ مقصد ایک ہے۔۔۔۔ اور فکر بھی مثبت۔۔۔۔ لگن سچی ہے۔۔۔۔ تو منزل بھی پٹی ہے۔

آج نئے سال کی آمد پر۔۔۔۔ سفیر کا دوسرا شمارہ آپ کے ہاتھوں میں ہے۔۔۔۔ اور پہلے شمارے کی بازگشت آپ کی باتوں میں۔۔۔۔ سفیر کی باتیں آپ تک پہنچنا۔۔۔۔ آپ کا حق ہے۔۔۔۔ اور انہیں آپ تک پہنچانا ہمارا قومی فرض۔

سچ کو آپ تک پہنچانے کا ذمہ سفیر نے اٹھایا ہے۔۔۔۔ اور یوں حق و باطل کا فرق مٹایا ہے۔۔۔۔ ہمارا سفر جاری ہے۔۔۔۔ فکر سے تعمیر تک۔۔۔۔ تحریر سے تقریر تک۔۔۔۔ اور سفر میں کامیابی مشروط ہے۔۔۔۔ جدوجہد سے۔۔۔۔ بے لوث جذبہ سے۔

وقت اور حالات کا تقاضا ہے۔۔۔۔ بس ہمیں اپنے اعصاب کو مضبوط رکھنا ہے۔۔۔۔ اور اجتماعی مفاد کے لئے اپنی ذاتی خواہشات اور جذبات کو مفقود۔۔۔۔ ہماری منزل اب زیادہ دور نہیں۔۔۔۔ لیکن منزل کی قربت کا سحر بھی۔۔۔۔ ہماری بڑھتی رفتار کو متاثر نہیں کر سکتا۔۔۔۔ اب ہم صرف اور صرف منزل پر پہنچ کر ہی دم لیں گے۔۔۔۔ یہی ہمارا ارادہ ہے اور اپنے قائد سے وعدہ بھی۔

آخر میں تمام قارئین اور قلم کاروں کو سالِ نو کی بہت بہت مبارک باد۔

عباد الرحمن

سنٹرل آرگنائزر ایم کیو ایم امریکہ

خیالِ سفیر

آپ کے ہاتھوں میں مجلہ ”سفیر“ کا دوسرا شمارہ ہے اور اس مختصر مدت میں دوسرے شمارے کی اشاعت ممکن ہوئی ہے آپ یعنی قارئین کی حوصلہ افزائی سے اور ناقدین کی تعمیری و اصلاحی تنقید سے جس کی بدولت ہمیں اپنی غلطیاں سدھارنے کا موقع بھی ملا اور ذریعہ بھی۔

سب سے پہلے تو آپ تمام حق پرست عوام کو سالِ نو کی بہت بہت مبارکباد۔

اس نئے سال میں نئی امیدوں، نئی باتوں، نئے ارادوں اور نئے انداز کے ساتھ آپ کے اس سفیر کی یہ پوری کوشش ہوگی کہ حق کی سفارت کو پوری دیانت اور امانت کے ساتھ آپ تک نہ صرف پہنچائے بلکہ آپ کے دلوں کی آواز اور ذہنوں کی سوچ بھی بن جائے۔

ہم ایسے وقت میں نئے سال میں قدم رکھ رہے ہیں کہ جہاں دنیا کو معاشی، سیاسی اور سماجی مشکلات کا سامنا ہے، وہیں عالمی دہشت گردی مہذب دنیا کے لئے مسلسل خطرہ بنی ہوئی ہے۔ ”War on Terror“ یا عالمی دہشت گردی کے خلاف جہاں جنگ جاری ہے وہیں عالمی ذرائعِ ابلاغ میں لفظ جہاد کی تعریف (Definition) اور تکرار روز بروز بڑھتی جا رہی ہے۔

انتہا پسند طاقتیں جہاں مذہب اور جہاد کی آڑ میں بلا تفریق رنگ و نسل معصوم انسانوں کے قتل عام میں مصروف عمل ہیں وہیں ترقی پسند سوچ رکھنے والی قوتیں مذہبی رواداری، مساوات اور معاشی استحکام کے لئے پوری قوت کے ساتھ اپنا کردار ادا کر رہی ہیں۔

ایم کیو ایم کا شمارہ بھی دورِ حاضر کی ان چند ترقی پسند تحریکوں میں ہوتا ہے کہ جنہوں نے اپنی قوم کے جائز حقوق اور ان کے ساتھ روار کھی جانے والی نا انصافیوں اور زیادتیوں کے خلاف نہ صرف آواز بلند کی بلکہ اپنے قیام کے فوری بعد ہی غربت، افلاس، بے روزگاری، نا انصافی اور جمالت کے خلاف عملی جدوجہد کا آغاز کیا۔

ایم کیو ایم نے جہاں معاشی و سماجی ناہمواریوں کو معاشرے سے دور کرنے پر زور دیا وہیں پاکستان کی نصف صدی سے کچھ زیادہ عرصہ پر محیط تاریخ میں پہلی بار Educated Leadership کا تصور روشناس کرایا کہ جب ملک کے ایوانوں میں برسوں سے قابض جاگیرداروں، مذہبی چغادریوں، وڈیروں، سرداروں اور نا اہل سیاستدانوں نے ایم کیو ایم کے پلیٹ فارم سے منتخب تعلیم یافتہ اور مل کلاس طبقہ سے تعلق رکھنے والے نوجوانوں کو اپنے درمیان پایا۔ یہ نہ صرف اس elite class کے لئے بڑے اچھنبے کی بات تھی بلکہ خود پاکستان کے فرسودہ نظام میں

قید ۹۸ فیصد عوام کے لئے ایک ایسا surprise تھا کہ جس کی توقع وہ اس سے پہلے نہیں رکھتے تھے۔ ملک کی معاشی ترقی، انصاف کی فراہمی، سیاسی بے یقینی کے خاتمے اور معاشرتی مساوات کے لئے ایم کیو ایم نے پاکستان میں جس ”مڈل کلاس آرڈر“ کو متعارف کرایا آج دنیا کی تمام ہی مہذب قومیں اور ترقی یافتہ ممالک عالمی امن کے یقینی استحکام کے لئے Middle Class Order کی ضرورت کو نہ صرف محسوس کر رہے ہیں بلکہ کھل کر اس پر بات بھی کر رہے ہیں۔ بلاشبہ یہ ایم کیو ایم کی فکر اور اس کے بنیادی فلسفہ کی کھلی جیت کہی جاسکتی ہے۔

۲۰۰۴ء جہاں نئی امیدیں اور خوشیاں لے کر آ رہا ہے وہیں گذرا ہوا سال ہمارے لئے ماضی کا وہ پتہ ہے کہ جس کے آئینے میں ہم اپنے مستقبل اور اس نئے سال کو بہتر انداز میں تراش سکتے ہیں۔

کسی بھی قوم کی نوجوان نسل کو کہ جو محرومی اور ناانصافی کا شکار ہو اس کے پاس دو ہی راستے ہوتے ہیں پہلا اجتماعی خود کشی کا اور دوسرا مسلسل جدوجہد کا۔ وہ نوجوان کہ جو محرومی کو مایوسی کا رنگ نہیں دیتے اور تقدیر کو بدلنے کا ارادہ رکھتے ہیں ایسے نوجوان جدوجہد اور مسلسل جدوجہد پر یقین رکھتے ہیں۔

دن، مہینے، موسم حتیٰ کہ سالوں کی تبدیلی بھی ان کی سوچ، فکر، مقصد اور بلند ارادوں پر اثر انداز نہیں ہوتی۔ سال نو کی آمد پر جہاں دنیا میں آبادان ہی جیسے دیگر نوجوان جشن منا رہے ہوتے ہیں، خوشیاں بانٹ اور سمیٹ رہے ہوتے ہیں وہیں اپنی قوم کے مستقبل کی فکر لئے یہ نوجوان اس نئے سال کو کامیابی کی امید سے تعبیر کرتے ہیں۔۔۔ جدوجہد کو تیز کرنے کا عزم کرتے ہیں۔۔۔ کامیابی تک پہنچنے کے نئے راستے تراشتے ہیں۔۔۔۔ منزل کے خدو خال وضع کرتے ہیں۔۔۔۔ اور اپنے ذہنوں میں قوم کی خوش حالی کا تصور بساتے ہیں۔ ہماری نیک تمنائیں اور دعائیں ایسے ہی پر عزم نوجوانوں کے ساتھ ہیں جو حق و سچ کی تحریک کے لئے اپنا قومی کردار ادا کر رہے ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ یہ نیا سال پاکستان کی مظلوم قومیتوں کے لئے خوشی کی نوید لے کر آئے گا اور یقیناً کامل اس بات پر کہ بہت جلد قائد تحریک جناب الطاف حسین کی قیادت میں ہم منزل مقصود کو حاصل کر لیں گے۔

آخر میں ہم تمام قلم کار خواتین و حضرات کے بے حد مشکور ہیں کہ جنہوں نے ”سفر“ کے لئے اپنی نگارشات ہمیں بھیجیں اور ان تمام قلم کار ساتھیوں سے معذرت کہ جن کی تحریریں جگہ کی کمی یا تاخیر سے موصول ہونے کی وجہ سے شامل اشاعت نہ ہو سکیں۔

دا سلام

-----آپ کا سفیر-----

تحریک آزادی سے آزادی

ایک نظر میں

امین حیدر (شکاگو)

سلطنت کیسے ہاتھوں سے نکل گئی؟ غدر یا تحریک آزادی کیوں ناکام ہوئی؟ انگریزی حکومت کیسے قائم ہوئی اور اس کی کامیابی کے کیا اسباب ہیں؟ 1857ء کی جنگ آزادی جسے غدر بھی کہا جاتا رہا ہے۔ انگریز مورخ اسے محض ایک بغاوت کیوں کہتا ہے؟ وغیرہ وغیرہ ایسے بہت سے سوالات ذہن میں ابھرتے رہتے ہیں جن کے جوابات مل کر بھی نہیں ملتے ذاتی طور پر میں 1857ء کی جنگ کو تحریک آزادی ہی خیال کرتا ہوں۔ اس میں میرے مسلمان ہونے کی وجہ بھی ہو سکتی ہے۔ مگر بغاوت کی دلیل میں یہ بھی حقیقت ہے کہ جوں ہی کسی گاؤں یا ضلع سے سرکش گروہ یا باغی گروہ کو ہٹایا جاتا تھا۔ وہاں سکون اور امن لان فوری طور پر قائم ہو جاتا تھا۔ اس امر کے برخلاف ایسے واقعات بھی سامنے آتے ہیں کہ وطن پرست انگریزوں سے لڑتے وقت تیزتر ہو جاتے تھے، جانی اور مالی نقصان بھی ہوتا تھا۔ مگر ان متواتر شکستوں کے باوجود وہ کہیں نہ کہیں پھر منظم ہو کر انگریزوں سے لڑنے پہنچ جاتے تھے جو ان کی تحریک آزادی کی دلیل ہے مگر اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ اس تحریک آزادی میں نہ مرکزیت تھی اور نہ ہی کبھی پیدا ہوئی۔ مرکزیت نہ پیدا ہونے کی ایک ظاہری وجہ اس وقت ہندوستان میں جذبہ قومیت کا فقدان بھی ہو سکتا ہے۔ اگر دیکھا جائے تو حضرت خان، صاحب، شیو سلطان، جھانسی کی رانی، نواب سراج الدولہ اور فیض آباد کے مولوی صاحب جیسے نامور رہنما اپنے اپنے علاقوں تک محدود تھے۔ جہاں اس بات کے شواہد ملتے ہیں کہ اس تحریک آزادی میں ہندو مسلم اور سکھوں نے مل کر شرکت کی، وہیں یہ بھی ثبوت ملتے ہیں کہ میر جعفر، میر صادق کے ساتھ ساتھ بے شمار ہندوؤں نے کھل کر انگریزوں کا ساتھ بھی دیا۔ ورنہ یہ کیسے ممکن ہے کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے تحت کاروبار کے پیمانے انگریز اتھارٹی کا میاب ہو جاتا۔ 1600 میں ایسٹ انڈیا کمپنی ملکہ الزبتھ اول سے اجازت لے کر ہندوستان آئی اور دیکھتے دیکھتے نہ صرف اپنے مقابلے کے دیگر یورپی حربوں کو بھٹکا کر کاروباری میدان میں بہت طاقتور ہو گئی بلکہ ان کی فوجی قوت میں بھی بے پناہ اضافہ ہو گیا۔ ایسٹ انڈیا فوجی اعتبار سے اس قدر کامیاب کیسے ہوئی؟ اس کی ظاہری وجہ دہلی کی حکومت کی کمزوری تصور کیا جاتا ہے۔ مگر انگریز اندر ہی اندر اتنا طاقتور ہو جائے اور کسی کو کان دکان خبر نہ ہو، یہ ایک بڑا سوال ذہن میں ابھرتا ہے، اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ مسلمانوں نے سینکڑوں برس ہندوستان میں حکومت کی مگر ہندوؤں نے اسے دل سے کبھی تسلیم نہیں کیا تھا تو یہ ایک فطری بات ہے۔ اس طرح ان ہندوؤں کو جو مسلمانوں کی حکومت سے چمٹکارا حاصل کرنا چاہتے تھے، انہیں انگریزی حکومت کی صورت میں اس کا امکان نظر آنے لگا۔ ویسے بھی ہم مسلمانوں نے کبھی ہندوؤں کے دل و دماغ چیتنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ اگر ہماری لیڈر شپ میں ہی وژن ہو تا اور وہ اچھوت کو عزت اور برابری کا درجہ دیتے یا سکھوں کا اس وقت اعتماد حاصل کر لیتے جس وقت گرو گوبند سنگھ اپنے مذہب کے طور طریقوں اور اصولوں کو وضع کر رہے تھے۔ مطالعہ کرنے سے محسوس ہوتا ہے کہ ان کے وضع کردہ مذہبی اصول اسلام سے بہت قریب تھے۔ اس کے برخلاف ان کی پوری زندگی اور نگہ زیب عالمگیر اور ان کے منظور نظر راہے مہاراجوں سے نبرد آزما ہوتے گذری ہے۔

ان کی مسلمانوں سے صرف مذہبی غیر ہم آہنگی تھی مگر زبان و ثقافت کی کڑی سے کڑی بڑی ہوئی تھی یہی وجہ ہے کہ آزادی کی جنگ دونوں نے مل کر لڑی اور یہ سلسلہ کسی نہ کسی صورت میں 1947ء تک جاری رہا۔ 1857ء کی جنگ میں ناکامی کے بعد مسلمانوں کے حالات بہر حال بہت خراب ہوئے، یہ ایک ایسی عبرت ناک تاریخی حقیقت ہے جس پر جتنا بھی غور کیا جائے کم ہے۔ کیونکہ یہ وہ حقیقت ہے کہ جس نے ہندوستان پر مسلم حکمرانی کے اس سترے باب کو اختتام تک پہنچایا جس کی حیثیت صرف ایک افسانے کی سی ہو کر رہ گئی ہے۔ اس کے بعد سے ان کے ذہن میں ناکامیوں، رسوائیوں اور ذلت کے سوا کچھ نظر نہیں آتا، اس تحریک آزادی میں شکست کے بعد مسلمانوں کی کمر ٹوٹ گئی، وہ نئے حالات کا شکار ہو گئے، ہندوؤں نے ان حالات سے خوب فائدہ اٹھایا۔ انگریزی تعلیم حاصل کی۔ ملازمتوں میں انہیں فوقیت حاصل ہوئی۔ کاروبار میں انہیں کامیابیاں حاصل ہوئیں۔ مسلمانوں کے لئے دروازے بند کئے جانے لگے۔ سرکاری طور پر محض ہندوؤں کی تقرری کی ہدایت جاری کی جانے لگیں۔ ان حالات کی وجہ سے مسلمانوں میں نہ صرف بددلی پیدا ہو رہی تھی، بلکہ انہوں نے ہندوؤں کو بھی اپنی بربادی کا ذمہ دار تصور کر دیا تھا۔ انگریز حکومت کی توسلش ہی تھی کہ ”لڑاؤ اور حکومت کرو“ ویسے بھی انہوں نے حکومت، مسلمانوں کے ہاتھوں سے ہی لی تھی۔ ظاہر ہے کہ وہ مسلمان ہی کو اپنا دشمن اول بھی تصور کرتے تھے۔ لہذا ان کے لئے کسی قسم کی مراعات سے ان کے مفادات کو نقصان ہی پہنچتا۔ مسلمانوں میں بے روزگاری اور مایوسی بڑھنے لگی۔ اور چند ہی برسوں میں ملک کی سب سے خوش حال آبادی، بد حالی کی انتہا تک پہنچ گئی۔ سیاسی، سماجی، تمدنی اور ثقافتی طور پر مسلمان بہت پس ماندہ ہو گئے۔ ایسے حالات میں سر سید احمد خان نے مسلمانوں کو اس تنزلی کے دلدل سے نہ صرف نکالا بلکہ علیگڑھ مسلم یونیورسٹی کی بنیاد رکھ کر مسلمانوں کی شعوری دنیا میں ایک ایسا انقلاب برپا کر دیا کہ جس کی وجہ سے انہیں سرگرمی میں روشنی نظر آنے لگی۔ بے شک سر سید احمد خان کا یہ کارنامہ کبھی فراموش نہیں کیا جاسکتا، علیگڑھ نے مسلمانوں میں نہ صرف تعلیم کی خودالی بلکہ ان کی شعوری تربیت کی۔ جس کی وجہ سے وہ کھویا ہوا

اعتماد ان میں واپس آنے لگا۔ جس کی وجہ سے وہ کبھی صاحب کمال تھے۔ اس شعوری تربیت کے ساتھ ساتھ سیاسی طور پر بھی انہوں نے پیش رفت کی۔ مسلم لیگ سے پہلے انہوں نے کانگریس میں شمولیت حاصل کی۔ گوکہ کانگریس کا بانی ایک انگریز اے ایچ ہیوم تھا اور اس کا ابتدائی مقصد فلاحی تھا نہ کہ سیاسی، مگر کانگریس بنانے میں ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کا بڑا حصہ ہے۔ بلکہ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ ہندوستان کی مکمل آزادی کی تجویز سب سے پہلے حسرت موہانی نے کانگریس میں پیش کی تھی۔ اگر ہندوؤں میں گاندھی، نہرو اور ٹیل جیسے لیڈروں کے نام آتے ہیں تو مسلمانوں میں مولانا آزاد، مولانا محمد علی جوہر، مولانا حسرت موہانی، حکیم اجمل خان جیسے نام بھی نظر آتے ہیں جنہوں نے کانگریس کو مضبوط اور مقبول بنانے میں اہم کردار ادا کیا۔ خود قائد اعظم ایک وقت میں کانگریس میں تھے۔ مسلمانوں کے اس غلوں اور جذبہ ایثار کے باوجود کانگریس میں ایک طبقہ ایسا رہا ہے جو مسلمانوں کا مخالف رہا ہے۔ اس طبقے کی مسلمان دشمنی اتنی شدید رہی کہ قائد اعظم محمد علی جناح جیسے لیبرل مسلمان نے اسے محسوس کیا اور بدل ہو کر اس سے علیحدگی اختیار کی۔ اس سے پہلے انہوں نے مسلم ہندو اتحاد کی بے پناہ کوششیں کیں۔ ان کے چودہ نکات اس ضمن میں خاصے مقبول ہوئے۔ مگر کانگریس ہندوؤں کی سازشوں اور ذہنیت نے ان کی ہر سعی کو ناکام بنا دیا۔ کانگریس میں جو ناانصافیوں مسلمانوں کے ساتھ ہوئیں آج پاکستان انہی ناانصافیوں کی دین ہے۔ اگر تاریخی حقائق کو نظر میں رکھا جائے تو مسلمانوں پر تقسیم ہند کی جتنی ذمہ داری آتی ہے اتنی ہی کانگریس ہندو لیڈروں اور ہندوؤں کو مسابھا جیسی انتہا پسند جماعتوں پر بھی عائد ہوتی ہے۔ مسلمانوں کے دور میں ہندو اور مسلمانوں کو برابر حقوق حاصل تھے اسلامی حکومت میں ہندو غلام نہیں تھا۔ اس دور میں ہندوؤں کا کبھی قتل عام نہیں ہوا۔ اس کے برخلاف انگریزی دور، غلامی اور ظلم کا دور تھا۔ انگریز ہندوستان دولت لوٹنے آیا تھا۔ اس نے ہندوستان کو کبھی اپنا وطن خیال نہیں کیا۔ برخلاف اس کے مسلمانوں نے ہمیشہ اسے اپنا وطن جانا، ہندوستانی تہذیب اور ثقافت میں اپنے آپ کو سمایا۔ ان کی آمد سے قبل ہندوستان ٹکڑوں میں تقسیم تھا۔ اس کو متحد اور مستحکم بنانے میں مسلمانوں کا بڑا ہاتھ تھا۔ آج بھی مسلمانوں کے کباوا اجداد وہاں مدفون ہیں۔ کتنے انگریز ہیں جو آج ہندوستان میں پائے جاتے ہیں یا دفن ہیں؟ مسلمانوں نے جس انصاف اور کامیابی سے ہندوستان پر حکومت کی ہے اس کے اعترافات خود نہرو کی کتاب "Discovery of India" میں موجود ہیں۔

بہر حال حقیقت یہ ہے کہ ہندوستان کو تقسیم ہونا تھا۔ انگریز نے اس بات کو اچھی طرح محسوس کر لیا تھا۔ ویسے بھی جنگ عظیم دوم کے بعد ان کی کالونیوں کی پالیسی میں بہت واضح تبدیلی آئی تھی۔ مگر اپنی اس پالیسی پر وہ اب بھی کاندھ تھا کہ کوئی نہ کوئی فساد یا تنازعہ چھوڑ کر جاؤ تاکہ یہ لوگ آپس میں لڑتے رہیں اور ہمیشہ ایک کمزور قوم بن کر رہیں بالخصوص مسلمان، ایک بحث یہ بھی ہے کہ پاکستان کا وجود انگریز اور ہندو انتہا پسندوں کی سازش ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ ہندوستان کیا تقسیم ہوا، مسلمان تقسیم ہو کر رہ گیا۔ آج پاکستان اور بنگلہ دیش کی صورت میں دو مسلم ریاستیں نظر آتی ہیں۔ دونوں ہی معاشی، سیاسی اور تمدنی اعتبار سے کمزور ہیں۔ ہم میں اتحاد اور قومیت کا آج بھی فقدان ہے۔ قومیت سے میری مراد اسلامی تشخص ہے۔ ہم انفرادی طور پر تو مسلمان ہیں۔ مگر اجتماعی اعتبار سے بھگالی، سماج، سندھی، پنجابی، پٹھان، بلوچی وغیرہ وغیرہ ہیں۔ نقلی میدان میں لوگ آگے جا رہے ہیں اور ہم پیچھے۔ جس کے لئے شائد ہمیں پھر ایک سرسبز احمد خان کی ضرورت پڑ گئی ہے۔ اگر کھلے دل سے جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ جہاں کچھ مسلمان تقسیم کے خلاف تھے، وہیں ہندوستان کے مسلمانوں کا بڑا طبقہ ہندوؤں پر اپنا اعتماد کھو چکا تھا۔ مسلمانوں کے بے شمار سرکردہ لیڈر کانگریس کی ناانصافیوں اور زیادتیوں کی وجہ سے اس سے علیحدہ ہو رہے تھے۔ تقسیم سے پہلے ان ناانصافیوں کی طویل فہرست ہے۔ جسے رقم کرنا میرے لئے اس وقت ممکن نہیں۔ مگر ایک واقعے کی نشاندہی کرتا چلوں۔ 1935ء کے ایکٹ کے مطابق جب کانگریس کی ورکنگ کمیٹی نے یہ طے کیا تھا کہ جب صوبائی خود مختاری حاصل ہو جائے گی اور اپنی حکومت بنائی جائے گی تو صوبائی کانگریس کا صدر ہی صوبے کا وزیر اعلیٰ بھی ہوگا۔ مگر جب صوبائی خود مختاری ملی تو ہندو وزیر اعلیٰ بنے اور کسی غیر ہندو کو وزیر اعلیٰ نہیں بننے دیا گیا۔ اس وقت ہمارا کانگریس کے صدر ڈاکٹر سید محمود تھے۔ انہیں وزیر اعلیٰ نہیں بننے دیا گیا۔ اس قسم کی ناانصافیوں اور کانگریس کے دوہرے معیار کا کچھ نہ کچھ اثر تو ہونا ہی تھا۔ اب جو ہونا تھا وہ تو ہو چکا۔ دیکھنا یہ ہے کہ آج نصف صدی سے زیادہ گزرنے کے باوجود ہم کیا کر رہے ہیں۔ کیا اپنے عمل سے ہم یہ ثابت کرنے کی کوشش کر رہے ہیں کہ ہمارے خلاف واقعی ایک سازش ہوئی ہے اور ایک ذہنی غلام اور بے مقصد انسان کی طرح اپنی ناکامیوں کے جواز تلاش کر رہے ہیں۔

اگر ایسا نہیں ہے تو ہم کس طرح یہ ثابت کر سکتے ہیں کہ پاکستان ایک شعوری نظریہ ہے۔ اس کا وجود حقیقی بنیاد پر ہے۔ اس کا وجود ناانصافیوں کی بنا پر ہوا تھا۔ یہ ایک محاسبہ ہے جو ہم سب کو انفرادی طور پر خود کرنا پڑے گا۔ بغیر کسی پر الزام لگانے۔ وقت آگیا ہے کہ ہم پاکستان کو ایسی ریاست بنائیں جو وجود میں تو ظلم اور ناانصافیوں کی وجہ سے آئی تھی مگر اس میں انصاف کا بول بالا ہو۔ تحریر و تقریر کی آزادی ہو۔ علم کا پرچار ہو۔ مہبتوں کا حوالہ ہو۔ اخوت کا نمونہ ہو۔ جمہوریت کی فروانی ہو۔ تمدن کا شاہکار ہو۔ سائنسی ترقی کا نشان ہو۔ قانون کی بالادستی ہو اور ہر پاکستانی نغمہ سرا ہو۔

یہ میرا پاکستان ہے یہ تیرا پاکستان ہے۔

اپنے دیار کی باتیں

طلعت اشارت (فلاؤلفیا)

دیارِ غیر میں اپنے دیار کی باتیں
چلو سائیں تمہیں حسنِ یار کی باتیں
اُدھر اُدھر کی سنیں اور اُدھر اُدھر کی سائیں
کبھی ہوں شہر کبھی شہر یار کی باتیں
دُھلی دُھلی سی فضاؤں سے جے افلاک
وہ مدھ بھری سی فضاؤں وہ شبنمی راتیں
کرن دکتی ہوئی شام سے الجھتی ہوئی
چلو میں صحنِ چمن کے منظر کی سوغاتیں
سفر نصیب قدم میں ہزار زنجیریں
خیال و خواب ہوئیں وہ حسین ملاقاتیں
وہ دن کا حسنِ گریزاں وہ میرا حسنِ گماں
نظر نواز وہ جلوے ، وہ دلنشین گھاتیں
چمک رہی ہے بہت دور میرے دیس میں صبح
اُتر رہی ہیں مرے ذہن و دل پہ بارائیں
یہ تار تار قبائیں یہ بد نماں لباس
لو رلاتی ہیں دل کو نفاق کی باتیں

فرازِ عشق سے طلعتِ فرازِ ذاتِ تلک
جنونِ حُبِ وطن کو یہ کس نے دیں ماتیں

خداشات و خطرات۔۔۔۔۔ انسانی ارتقاء میں حائل رکاوٹیں

خورشیدالحق (نویادک)

یہ انسانی فطرت ہے کہ وہ کسی فیصلے پر پہنچنے سے قبل سوچتا ہے اور اپنے کل سے متعلق فیصلہ کرنے سے قبل خداشات اور خطرات کا جائزہ لیتا ہے۔ شعور، اشعور اور تحت اشعور انسان کو اس بات کی ضرورت پر آمادہ کرتا ہے کہ وہ اپنی سوچنے، سمجھنے اور فیصلہ کرنے کی صلاحیت کو بڑھائے تاکہ وہ اپنے مستقبل کے حوالے سے آنے والے خطرات اور ذہن میں پلنے والے خداشات کی مطابقت سے اپنے لئے بہترین عملی راستے کا انتخاب کر سکے۔ ہمارے خیال میں یہ کسی بھی صحت مند دماغ اور ذہن کی علامت ہے کہ وہ تمام تر صورتحال، حالات و واقعات، ارد گرد کے ماحول اور اپنی ترجیحات کو سامنے رکھتے ہوئے ہر وقت فیصلہ کرے اور خداشات و خطرات کو کسی صورت غالب نہ آنے دے۔

یہ ساری چیزیں practice پر منحصر ہوتی ہیں یعنی جو انسان جتنا زیادہ اپنے Brain Cells کا استعمال کرے گا اسی طور اس کی صلاحیتوں میں نکھار آئے گا۔ وہ نہ صرف اپنے آج کو بہتر طور پر دیکھ پائے گا بلکہ اپنی Judgement کی بنیاد پر اپنے مستقبل کی تصویر کشی کر سکے گا۔ انسانی فیصلوں میں خداشات و خطرات یا دوسروں لفظوں میں Risk factor خاصے حد تک اثر انداز ہوتے ہیں۔ اسی لئے آج کی جدید دنیا میں Risk Management سے متعلق Courses نصاب میں شامل ہوتے ہیں جن کی مدد سے یہ سمجھانے کی کوشش کی جاتی ہے کہ آپ زندگی کے مختلف شعبوں اور ترقی کے مختلف راستوں میں حائل رکاوٹوں، خداشات اور خطرات کا مقابلہ کیسے اور کیونکر کر سکتے ہیں۔ صحیح اور بروقت فیصلے جس طرح انسانی زندگی کے سفر میں حائل خداشات و خطرات کے اثرات کو آہستہ آہستہ زائل کرتے ہیں اور انسان کی خود اعتمادی یا Self Confidence میں اضافہ کرتے ہیں بالکل اسی طرح خداشات و خطرات کی رو میں بہہ جانے والے انسان تباہی و بربادی کے راستے پر چل پڑتے ہیں۔ محنت، لگن، خلوص اور اپنی تمام ذہنی و جسمانی صلاحیتوں جیسے عناصر خداشات و خطرات کے مقابل آتے ہیں اور انسان جیسے ہی ان پر قدرت حاصل کر لیتا ہے تو وہ اپنے ذہن میں پلنے والے خداشات اور خطرات کو شکست دے دیتا ہے اور کامیابی کے راستوں کا ہم سفر بن جاتا ہے۔

جس طرح انفرادی سطح پر انسان اپنے مستقبل اور بقاء کے حوالے سے خداشات و خطرات سے مستقل طور پر نبرد آزما رہتا ہے بالکل اسی طرح اجتماعی سطح پر کوئی قوم بھی اپنے آنے والے کل اور اپنے بہر مستقبل کی جدوجہد میں حائل خداشات اور خطرات کا مقابلہ کرتی ہے۔ اس مقابلے میں ہار اور جیت کا فیصلہ قوم کی جانب سے کئے گئے فیصلوں اور اس کے مثبت یا منفی اثرات کرتے ہیں یا پھر تاریخ کے صفحات کیا کرتے ہیں۔ قوموں کا ارتقاء، اس کا سفر اور اس سفر میں کامیابیوں اور ناکامیوں کا انحصار قوم کے مزاج، اس کی اجتماعی صلاحیتوں اور Decision Power پر Depend کرتا ہے۔

معاشی، سیاسی اور سماجی استحکام کو پانے کے لئے قوموں کو کئی مواقع پر دیراندہ اور دور رس نتائج کے حامل فیصلے کرنے پڑنے ہیں۔ بے چینی اور بے یقینی جیسی صورتحال اور اجتماعی سطح پر موجود خطرات قوموں کے اعتماد کو متزلزل کرتے ہیں۔ ایسے وقت میں صبر و تحمل یعنی Patience رکھنے والی قومیں ہی دور رس فیصلوں کے دور رس نتائج کو حاصل کرتی ہیں اور اپنے مستقبل کو روشن کر لیتی ہیں۔ آج کی ترقی یافتہ دنیا میں فہم و ارادہ رکھنے والی قیادت Leadership اپنی قوم کے مزاج اور صلاحیتوں کو مد نظر رکھتے ہوئے معاشی اور سیاسی اصلاحات Economic & political reforms کو نہ صرف ترتیب دیتی ہے بلکہ اپنی ذہانت اور پیش نظر حالات و واقعات کی بنیاد پر آنے والے ۲۵ سے ۵۰ سال تک کی پالیسیاں ترتیب کرتی ہے۔

جیسے جیسے ذہنوں میں علم کے چراغ روشن ہوتے ہیں ویسے ویسے ذہن میں موجود خداشات اور خطرات لپٹائی اختیار کرتے ہیں اور انسانی ارتقاء میں حائل رکاوٹیں دیر بدیر دور ہو جاتی ہیں۔

غزل

عطیہ نیازی (لاس انجلس)

جب سے کچھ فرشتوں نے مسدیں سنبھالی ہیں
شر تو جہنم ہیں ، اور گاؤں خالی ہیں

زر پرست لوگوں نے جنتیں کمالی ہیں
عصمتِ وطن کی بھی بولیاں لگالی ہیں

آپ کی عنایت سے غم نصیب زندہ ہیں
زندگی سے عاری ہیں ، آرزو سے خالی ہیں

مادرِ وطن کو ہم بے ضمیر کیا دیتے؟
مانگنے کے عادی ہیں ، ہم تو خود سوالی ہیں

ہم نے دل کے گوشوں میں مسجدیں بنالی ہیں
آپ جیسے لوگوں کی صورتیں سجالی ہیں

آکھ ہی کے رستے سے آپ دل میں آئے ہیں
آکھ ہی کے رستے سے حسرتیں نکالی ہیں

رات دن کے سہنوں میں وہ ہمارے اپنے ہیں
وہ بھی ایک پہنا ہیں ، ہم بھی خوش خیالی ہیں

اُن کو آج کہنا تھا ، ہم کو آج سنا تھا
تہتیں لگانی تھیں ، تہتیں اٹھالی ہیں

حاسدوں نے عطیہ جی ! کیا عذاب ڈھلایا ہے
یہ مصیبتیں آخر آپ ہی نے پالی ہیں

Revolution of Roses

شازیہ ارشاد (ڈیلاس)



۲۱ نومبر ۲۰۰۳ء کی شام جارجیا کے دار الحکومت تبلیسی کی سڑکوں پر ناپتے گاتے ہنستے، مسکراتے اور فتح کے جذبات سے سرشار چہرے دنیا بھر کے ذرائع ابلاغ کے نمائندوں کے لئے توجہ کا مرکز رہا۔ ایک روز پہلے تک ہونے والے حکومت مخالف مظاہرے آج ایک ”خاموش“ انقلاب کی کامیابی کے جشن میں تبدیل ہو چکے تھے۔ جارجیا کے صدر ایڈورڈ شیورڈ ناڈزے جو تقریباً ایک دہائی تک ملک کے سربراہ مملکت رہے بالآخر عوامی طاقت کے سامنے بے بس ہو گئے اور تین ہفتے سے ملک میں جاری آئینی بحران کے بعد انہیں اپنے عہدے سے مستعفی ہونا پڑا۔

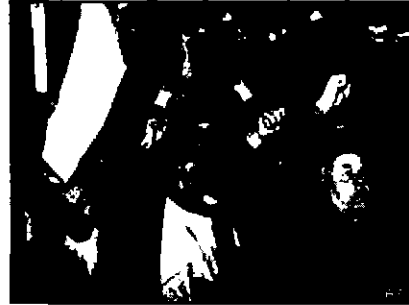
۲ نومبر ۲۰۰۳ء کو ہونے والے عام انتخابات کے بعد جارجیا میں عوامی بے چینی کا شدت کے ساتھ آغاز ہوا۔ ان عام انتخابات میں ایڈورڈ شیورڈزے اور ان کی جماعت نے کامیابی تو حاصل کی لیکن ملک کی اپوزیشن جماعتوں سمیت عوام کی اکثریت نے ان انتخابات کو محض دھونس اور دھاندلی سے تعبیر کیا اور انتخابات کے نتائج کو تسلیم کرنے سے صاف انکار کر دیا۔

جارجیا کے جمہوریت پسند عوام نے اپنی خواہشات اور اپنی آواز کو دنیا تک پہنچانے اور حقیقی جمہوری نظام کے قیام کے لئے پرامن احتجاج اور جدوجہد کا راستہ اختیار کیا۔ ہزاروں کی تعداد میں مظاہرین مظاہروں اور پرامن ریلیوں کے ذریعہ ایڈورڈ شیورڈزے پر یہ دباؤ ڈالتے رہے کہ وہ نہ صرف اپنے عہدے سے مستعفی ہو جائیں بلکہ ملک میں جاری آئینی بحران کا خاتمہ بھی کریں۔

اسی دوران دنیا نے وہ منظر بھی دیکھا کہ جب سینکڑوں مظاہرین پارلیمنٹ کے اجلاس کے دوران پارلیمنٹ کی عمارت کے اندر داخل ہو گئے اور ایڈورڈ شیورڈزے کو اپنی جان چھاننے کے لئے وہاں سے راہ فرار اختیار کرنی پڑی۔

اس منظر نے یہ بات بھی واضح کر دی کہ تمام تر اقتدار و اختیار کے باوجود ایڈورڈ شیورڈزے جیسے مضبوط حکمران بھی عوامی قوت کے سامنے بالکل بے بس ہو جاتے ہیں اور عوام جب چاہیں ملک کی مقتصد سے آمرانہ اور جاہلوں کو بھانسنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔

جارجیا کے صدر شیورڈ ناڈزے نوشہہ دیوار پڑھ چکے تھے چنانچہ اگلے ہی روز انہوں نے عوام کے غمیں و غضب کے سامنے اپنی نکتست کو استعفیٰ کی شکل میں قبول کر لیا۔ ان کے استعفیٰ کی خبر سن کر جارجیا کے غیور اور جمہوریت پسند عوام سڑکوں پر نکل آئے۔ ہر طرف روشنی کا سماں تھا۔ آسمان پر آتش بازی کے خوبصورت مناظر تھے۔ ایسا لگتا تھا کہ جارجیا کے عوام کو ایک نئی آزادی نصیب ہوئی ہے۔ خوشی اور کامیابی کے جذبات سے مغلوب مرد، خواتین، بوڑھے اور بچے ایک آواز ہو



کر یہ نعرے لگا رہے تھے ”Re-birth of Georgia“، ”Revolution of Georgia“ اور ”Long-Live Georgia“۔

دنیا بھر کے ذرائع ابلاغ نے جارجیا میں رونما ہونے والی اس بڑی تبدیلی کو ”Revolution of Roses“ کا نام دیا کہ جہاں بغیر کسی تشدد اور ہلاکت کے عوامی خواہشات، جذبات اور احساسات کو فتح نصیب ہوئی۔

آج جہاں دنیا بھر کے مختلف حصوں اور خطوں میں نظام اور طرز حکومت کی تبدیلی کی نہ صرف خواہش موجود ہے بلکہ اس خواہش کی بنیاد پر وہاں جدوجہد بھی جاری ہے۔

جارجیا میں رونما ہونے والی اس تبدیلی نے خواہش کو جدوجہد اور پھر جدوجہد کو کامیابی سے رنگ دیا، وہیں یہ پیغام بھی کہ جب عوام متحد اور منظم ہو جائیں تو پھر فرسودہ نظام اقتدار اور اختیار رکھتے ہوئے بھی بے بس ہو چلا کرتے ہیں اور عوامی طاقت کے سامنے بالآخر ڈھے جاتے ہیں۔

اب بھی نہ مانیں گے

شازیہ ارشاد (ڈیلاس)

میرے قائد کی صدا
حق کی صدا، ایسی صدا
جس نے پھیلا دی جہاں بھر میں
صداقت کی دباء
جس کے چہرے پہ جھلکتی ہے
محبت کی ضیاء
جس کے ہونٹوں پہ مچلتی ہے
لفظ سچ کی ندا
جیسے جیسے اس سیاہ رات کا ہر ظلم بڑھا
میرے قائد کی صداقت کا دیا تیز ہوا
تند ہواؤں میں بھی جلتا ہی رہا جلتا ہی رہا
حق کا سچائی کا لفظ کا عزائم کا دیا
اور جب ظلم کا اندھیرا ہوا حد سے سوا
اس کو سچائی کی کرنوں سے پھر مٹنا ہی پڑا
اور کیا ہوگا ثبوت اس سے بڑا کوئی بھلا
”اس کے اخلاص و عزائم پہ تو راضی ہے خدا“
یہ زمانے کے خدا اس کا کیا بگاڑیں گے
یہ بھلا اب بھی نہ مانیں گے تو کب مانیں گے

غزل

(تقی کمال، فلاڈیلفیا)

اکساری کے نئے ڈھنگ سکھائے جائیں
ہاتھ دشمن سے بھلا کیوں نہ ملائے جائیں

زہر آلود دھویں کیسے چھانے جائیں
کب تک خوں میں اپنے ہی نہائے جائیں

فیصلے سارے حقیقت پر اگر ہوں مبنی
پھر بھلا لوگ کیوں زنداں میں رُلائے جائیں

رہبر قوم کے ہاتھوں میں ہی گر ہو کشتول
کیسے اس قوم میں خود دار بنائے جائیں

اپنی ہی ذات کے محور میں مقید کیوں ہو
کام ہر شخص کو دوچار بتائیں جائیں

کیسے ممکن ہے کہ خالی وہ دُعاؤں سے رہیں
ہاتھ دل سے جو بعد عجز اٹھائے جائیں

ایک سچی کہانی

نواد قاضی (ڈیڑھ سٹ)

یہ ان دنوں کی بات ہے کہ جب ریحان، فیضان اور امر پانچویں کلاس کے طالب علم تھے۔ ایک روز جب کلاس ٹیچر نے کلاس کے تمام ہی چوں سے ان کی ترجیحات جانتی چاہیں کہ وہ بڑے ہو کر کیا بنا پند کریں گے؟۔۔۔۔ وہ زندگی میں کیا بنا چاہتے ہیں؟ تو کلاس کے تمام ہی چوں نے اپنے اپنے انداز میں اپنے مستقبل کی تصویر کشی کی اور جب باری ریحان، فیضان اور امر کی آئی تو ریحان اور فیضان نے کلاس کے بہت سے دوسرے چوں کی طرح انجمن اور کامیاب ڈاکٹر بننے کی خواہش ظاہر کی لیکن جب باری کلاس کے سب سے ہونہار طالب علم امر کی آئی تو اس کا جواب سن کر تمام چوں کی طرح خود کلاس ٹیچر بھی حیران رہ گئیں کہ امر نے یہ کیا کہا کہ وہ ”میں ایک اچھا انسان بنا چاہتا ہے۔“

دن مہینوں میں اور مہینے سالوں میں تبدیل ہوتے گئے اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ریحان، فیضان اور امر نہ صرف اپنی جوانی میں قدم رکھتے گئے بلکہ ان کی دوستی پہلے سے زیادہ مضبوط ہوتی چلی گئی۔ پھر وہ دن بھی آیا کہ جب تینوں نے میٹرک کے امتحان کو امتیازی نمبروں میں پاس کیا مگر ہمیشہ کی طرح اس بار بھی اپنے ہی دوستوں سے آگے رہا اور میٹرک کے نتائج میں وہ شہر بھی میں تیسری پوزیشن پر تھا۔

یوں تینوں ہی دوستوں کو شہر کے سب سے بہترین کالج میں داخلہ بھی مل گیا اور پلک جھپکتے میں ان کا لڑکپن کا دور سنجیدگی میں بدل گیا۔

س انہی دنوں شہر کے حالات خراب سے خراب تر ہوتے گئے۔۔۔۔ آئے دن کی گرفتاریوں، چھاپوں اور ہلاکتوں کی خبروں کو جیسے شہر کے کینوں کو خوف اور دہشت میں مبتلا کر دیا تھا۔۔۔۔ ہر کوئی سہم گیا تھا۔۔۔۔ ڈر نے جیسے دلوں میں مستقل گھر کر لیا تھا۔

امر جو پہلے ہی سے نہایت حساس طبیعت کا مالک تھا اور جس کے دل و دماغ میں یہ تھوڑا بہت اچھی طرح واضح تھا کہ اچھا انسان وہی ہوتا ہے کہ جو مصیبت کے وقت دوسروں کے کام آئے۔۔۔۔ اپنی قوم کے درد کو اپنا درد سمجھے۔۔۔۔ اور اپنے کل کو قوم کے لئے وقف کر دے۔

اپنے شہر کے لوگوں کے ساتھ یہ زیادتیاں اور ناانصافیاں اس کو دن رات بے چین کر رہی تھیں۔۔۔۔ اس ایسی ہی ایک بے چین کردینی والی رات اس نے اپنی زندگی کا وہ اہم فیصلہ کر لیا۔۔۔۔ شاید اس کی یہ بے چینی اسی فیصلے پر پہنچنے کی متلاشی تھی اور اس کے ساتھ ہی بہت دنوں بعد اسے سکون کی نیند آئی۔

وہ جب صبح اٹھا تو نہایت ہشاش بھاش تھا۔ ہمیشہ کی طرح صبح صبح کالج پہنچ کر اس نے اپنے ساتھی طلباء سے ملاقات کی مگر اس بار یہ ملاقات اس کے ساتھ رہنے والے تمام ہی طالب علموں کے لئے انتہائی مختلف اور حیران کن تھی۔ امر نے پہلی بار تعلیمی موضوع سے ہٹ کر بات کی تھی۔ اس نے اپنے تمام ہی ساتھیوں کو شہر میں ہونے والی ریاستی دہشت گردی اور بربریت سے آگاہ کیا اور انہیں یہ سمجھایا کہ ایک اچھے انسان کے کیا فرائض ہیں۔۔۔۔ ایک اچھے انسان کی کیا ذمے داریاں ہوتی ہیں اور ایک اچھے انسان ہونے کے ناطے ان کا یہ فرض ہے کہ وہ اپنی مصروفیات میں سے وقت نکال کر اپنی قوم پر ہونے والے ظلم پر کم از کم آواز احتجاج ضرور بلند کریں۔

ہستہ آہستہ امر اپنے ساتھیوں کو یہ باور کرانے میں کامیاب ہو گیا کہ طالب علم ہی قوم کا مستقبل ہوتے ہیں اور اگر قوم کا مستقبل تاریک نظر آ رہا ہو تو پھر طلباء برادری کو قوم کا ہر اول دستہ بن جانا چاہئے۔ امر کی یہ کوشش رنگ لانے لگیں اور اپنی ذات اور خواہشات میں قید پیشتر طلباء ذات کی زنجیروں کو توڑ کر امر کے ساتھ شامل ہوتے گئے، یہاں تک کہ کالج کے اساتذہ بھی ڈھکے چھپے لفظوں میں ہی سہی لیکن امر کے خیالات اور اس کی فکر سے متفق تھے۔

شہر میں ریاستی دہشت گردی روز بروز بڑھتی ہی جا رہی تھی، پھر ایک روز امر نے کالج میں یہ اعلان کر دیا کہ وہ شہر میں ہونے والی

زیادتوں اور ناانصافیوں کے خلاف طالب علموں کا ایک مظاہرہ کرنے جا رہا ہے۔
 امر اور اس کے ساتھی انتہائی مطمئن تھے کہ مظاہرہ بالکل پر امن ہوگا اور ہم اپنا موقف بھی آسانی سے لوگوں تک پہنچا کر اپنا فرض ادا کریں گے لیکن شاید قدرت بھی امر اور اس کے ساتھیوں کا امتحان لینا چاہتی تھی۔
 اگلے روز مظاہرے میں کئی سو طالب علم شریک تھے کہ جنہوں نے ہاتھوں میں پلے کارڈز اٹھا رکھے تھے کہ جن پر ریاستی ظلم و جبر کے خلاف نعرے درج تھے۔ کچھ ہی دور کالج کے کم و بیش تمام ہی اساتذہ بھی وہاں موجود تھے جو اپنے طلباء کی خاموش حمایت اور شہر میں برپا قیامت پر خاموش احتجاج کر رہے تھے۔
 ابھی امر نے اپنی تقریر شروع ہی کی تھی اور وہ اپنے ساتھی طلباء سے مخاطب تھا کہ لچاک ہی وہاں قانون نافذ کرنے والے اداروں کے سینکڑوں اہلکار آن پہنچے۔۔۔۔۔ پھر وہی ہوا کہ جو ہمیشہ سے ہوتا آیا ہے۔۔۔۔۔ مد امن مظاہرہ مد تشدد احتجاج میں تبدیل ہو گیا۔
 گرفتاریاں ہوئیں۔۔۔۔۔ آنسو گیس کا استعمال ہوا۔۔۔۔۔ لیکن ساتھی طلباء امر کو وہاں سے حفاظت نکالنے میں کامیاب ہو گئے۔
 اگلے دن سرکاری خرچہ پر چلنے والے تمام ہی اخبارات میں یہ سرخیاں نمایاں تھیں۔۔۔۔۔ ”ملک کی سلامتی کے خلاف بات کرنے والے طلباء کا مظاہرہ کچل دیا گیا“

”پر تشدد عناصر کا اجتماع ناکام۔۔۔۔۔ قانون نافذ کرنے والوں کی بروقت کارروائی“
 اس کے ساتھ ہی ملک کی سلامتی کے ذمے دار افسران کے یہ بیانات بھی اخبارات کی زینت بنے۔
 ”یہ طلباء دراصل انارکی پھیلانا چاہتے تھے“
 ”ملک کی سلامتی کے خلاف بات کرنے والوں کو سخت سزائیں دیں گے“
 ”مگر قاتر طلباء کے خلاف مقدمات چلائے جائیں گے“

اس کے ساتھ ہی امر کی تلاش بھی شروع ہو گئی اور اس کو مفروضہ قرار دے دیا گیا۔ ان تمام تر حالات و واقعات اور شہر کی بھڑکی صورتحال کے پیش نظر امر کو اپنا گھر اور کالج دونوں ہی چھوڑنے پڑے۔۔۔۔۔ جہاں اس کا اپنے ماں باپ، بہن بھائیوں سے رابطہ ٹوٹا تو وہیں ایک ہونہار طالب علم اپنی تعلیم کا سلسلہ مزید آگے جاری نہ رکھ سکا۔
 اپنی قوم اور اپنے شہر پر ہونے والے ظلم و نا انصافی پر امر نے کئی دوسروں لوگوں کی طرح اپنی جد و جہد جاری رکھنے کا فیصلہ کیا۔
 جیسے جیسے وہ اپنے کام کو مزید بڑھاتا گیا اور مختلف ذرائع سے ریاستی جبر کے خلاف اپنی بات لوگوں تک پہنچاتا رہا۔۔۔۔۔ ریاستی اداروں کے نزدیک وہ مزید خطرناک ہوتا چلا گیا۔

پھر ریاست نے امر کو حق و باطل کی انتہائی بھیاک سزا دی۔۔۔۔۔ جب ایک روز صبح شہر کے تمام ہی بازاروں اور معروف سڑکوں پر یہ پوسٹر چسپاں تھے۔۔۔۔۔
 ”امر علی خطرناک دہشت گرد اور ملک کا غدار ہے“۔۔۔۔۔ ”سر کی قیمت ۱۵ لاکھ روپے“

پھر امر کے رشتہ دار اور اس کے گھر والے ریاستی اداروں کے عتاب کا نشانہ بنے۔۔۔۔۔ چھاپے، گرفتاریاں معمول کا حصہ بن گئیں۔
 امر کو مجبور اپنے ملک کو چھوڑنا پڑا اور جلا وطنی کی زندگی گزارنے کے لئے قسمت اسے امریکہ تک لے آئی۔ یہاں آکر بھی امر نے قومی فرائض سے ایک لمحہ کے لئے غفلت نہیں برتی اور قوم کے جائز حقوق کے لئے کام جاری رکھا۔

وقت تیزی کے ساتھ گزرتا رہا اور امر اب امریکہ میں اپنی قوم کے لئے کام کرنے میں مصروف عمل تھا۔۔۔۔۔ وہ مختلف اجتماعات اور چھوٹی بڑی میٹنگز میں اپنے لوگوں کو ان کے شہر پر گزرنے والی قیامت کی روداد بتاتا رہا۔
 ایک ایسے ہی دن۔۔۔۔۔ ایسے ہی اجتماع میں حیرت انگیز طور پر امر کی ملاقات اپنے بھین کے دوستوں ریحان اور فیضان سے ہوئی۔
 ریحان ایک امریکی فرم میں انجینئر جب کہ فیضان ایک کامیاب نیورو سرجن بن چکا تھا۔

دونوں ہی امر سے مل کر بے انتماخوش ہوئے اور اس پر گزرنے والی قیامتوں پر اظہارِ افسوس کرنے کے بجائے دونوں نے امر کو زبردست خراجِ تحسین پیش کیا اور اپنی قوم کے لئے اس کی خدمات کا برملا اعتراف کیا۔
 اس ملاقات کے بعد امر جب رات سونے کے لئے لیٹا تو وہ پہلے سے زیادہ مطمئن تھا کہ وہ ایک ڈاکٹر اور انجینئر نہ سہی لیکن ایک اچھا انسان ضرور ہے جو اپنی قوم کے بہر مستقبل کے لئے اپنے مستقبل کو قربان کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے اور یہی اس کے نزدیک سب سے بڑی کامیابی اور انسانیت کی خدمت ہے۔

آزادی کے خواہشمند

عمران حسین (اس انجلیس)

چین کے صدر ہُو جِنَاؤ (Hu Jintao) نے گذشتہ دنوں یہ بیان دیا کہ ”تائیوان نے اگر آزادی کا کابعدہ اعلان کیا تو اسے متعلق جنگ سے تعبیر کیا جائے گا۔“

اس دوران چینی وزیر اعظم کے دورہ امریکہ کے موقع پر امریکی مجھ سے خراجہ کے ترجمان کا یہ بیان بھی منظور عام ہو گیا کہ ”امریکہ تائیوان کی جانب سے متعلق آزادی کی جانب پیش رفت کے لئے کسی بھی ممکنہ فیصلے کی حوصلہ افزائی ہرگز نہیں کرے گا۔“



بیانات اور جملہ بیانات کا سلسلہ اور تائیوان کے حوالے سے جاری تضییع نے اس وقت عزت اختیار کی کہ جب تائیوان کے صدر چین شوئی میان (Chen Shui-bian) نے ملک میں جاری انتہائی ٹیم کے دوران اس بات کا مدعا اعلان کیا کہ دوسری مدت کے لئے صدر منتخب ہونے کی صورت میں وہ تائیوان کی آزادی کے لئے عوامی ریفرنڈم کا انعقاد کریں گے۔

انہوں نے اپنے تمام ہی انتہائی جلسوں میں تائیوان کی متعلق آزادی اور خود مختاری پر زور دیا اور عوامی خواہشات اور جذبات کے کٹھن نظر تائیوان کی آزادی کے انتہائی حساس مگر اہم معاملے کو اپنی انتہائی ٹیم کا مرکز بناتے ہوئے۔

تائیوان جیسے چین اپنا حصہ سمجھتا ہے اور اسے اپنے سے جدا ہونے والا ایک صوبہ قرار دیتا ہے نہ سوس سے جاری بین الاقوامی تنازعات میں سرفہرست ہے۔

جہاں چین بھول اس کے تائیوان پر اپنی حاکمیت دوبارہ قائم کرنے کے لئے وقتاً فوقتاً دباؤ میں اضافہ کرتا ہے وہیں کسی بھی روٹی جارحیت سے تائیوان کو محفوظ رکھنے کے لئے امریکہ برسوں سے اپنا اہم کردار ادا کرتا رہا ہے اور تمام تر چینی مخالفتوں کے باوجود تائیوان کی سفارتی اور فوجی امداد کر رہا ہے۔

یوں تائیوان کی متعلق آزادی اور خود مختاری کا معاملہ جہاں تائیوانی اور چینی حکومتوں کے درمیان شدید کشیدگی کا باعث رہا ہے وہیں دنیا کی دوسری طاقتوں چین اور امریکہ کے مابین سفارتی چیلنڈر کا سبب بھی۔

تائیوان کے عوام کی جانب سے کی جانے والی آزادی کی جدوجہد دنیا میں آزادی کی تحریکوں سے قدرے مختلف ہے کہ جہاں تائیوان کے عوام کو کسی حمورہ یا ریاستی ظلم و جبر کا سامنا تو نہیں لیکن وہ بیرونی جارحیت کے منڈلاتے مستقل خدشات و خطرات سے متعلق آزادی بھی چاہتے ہیں اور اپنی قومی خود مختاری بھی۔

تائیوان کی قدیم تاریخ یہ بتاتی ہے کہ وہ کبھی چین کے زیر حکمران رہا تو کبھی ولندیزیوں کے زیر قبضہ۔۔۔۔۔ کبھی مذہبی حیزوں کے رحم و کرم پر تو کبھی سپانوی سلطنت میں۔۔۔۔۔ کبھی فرانسیسی حاکم ہونے تو اس کے بعد جاپانی وارد ہوئے۔ یوں تائیوان کے عوام بیرونی جارحیت اور حاکمیت کے عادی ہوتے چلے گئے اور پھر دوسری جنگ عظیم میں جاپان کی شکست کے بعد اتحادیوں (Allied Forces) کے مختلف فیصلے کے تحت تائیوان کا لٹھو نسق ایک بار پھر چینی حاکم کے حوالے کر دیا گیا۔

چین کے زیر انتظام آتے ہی یہاں سیر و نگاری ’ معاشی بد حالی اور بد عنوانی جیسے عفریت نے سر اٹھایا اور تائیوان کے عوام میں جنم لینے والی بے چینی نے بغاوت کا روپ دھار لیا۔

۱۹۴۷ء کے لوائل میں شروع ہونے والی اس شورش کو دبانے کے لئے چینی حکام نے ریاستی طاقت کا بے دردی سے استعمال کیا اور تائیوان کے باشعور طلباء، ڈاکٹرز اور وکلاء سمیت ہزاروں لوگوں کو اپنے حقوق کی آواز بلند کرنے کے جرم میں موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔۔۔۔۔ ہزاروں تشدد کا شکار ہوئے۔۔۔۔۔ اور ہزاروں ہی پابند سلاسل کر دیئے گئے۔



پھر ۱۹۴۹ء میں بدترین خانہ جنگی اور چینی کمیونسٹوں کے ہاتھوں شکست کے بعد چیانگ کانگ (Chiang Kai-Shek) اپنے لاکھوں حامیوں کے ساتھ تائیوان کی جانب نہ صرف فرار ہوا بلکہ اپنے حامیوں سمیت یہیں سکونت بھی اختیار کی۔ یوں اگلی چار دہائیوں تک تائیوان کے عوام چیانگ کے مملکت کو Martial Law Regime کے غلام رہے۔ جہاں وقت کی سونیاں بڑھتی گئیں وہیں حالات بھی اہنی ڈگر بدلتے رہے اور بدلتے حالات و واقعات کے ساتھ تائیوانی عوام کے مزاج بھی اور یوں آہستہ آہستہ بڑھتے عوامی شعور اور آزادی کی خواہنے تائیوان پر ہمیشہ ہی سے منڈلاتے چینی خطرے کے لئے اب سوالیہ نشان کھڑے کر دیئے ہیں۔

کیا دنیا کی بڑی طاقتیں تائیوان کے مستقبل کے حوالے سے ایک رائے پر متفق ہو پاتی ہیں؟ اور اس دیرینہ تنازعہ کا کوئی نہ امن حل نکل پاتا ہے یا نہیں؟ اس سے بالکل قطع نظر یہ بات طے ہے کہ تائیوان کے عوام کی اکثریت اپنی متعلق آزادی اور خود مختاری کی خواہناں ہے اور یہ بات بھی بالکل طے شدہ ہے کہ آزادی ایک جذبہ ہے۔۔۔۔۔ ایک احساس ہے۔۔۔۔۔ ایک خواہش ہے اور جائز جذبات احساسات اور خواہشات کو یوں قید رکھنا ۲۱ ویں صدی میں بڑی سے بڑی طاقت کے لئے بھی ناممکن ہے۔

انوکھا دیس

(اپنے پیارے شہیدوں کے نام) جنید منی۔ شکار کو

نصیبِ بادِ باراں ہے
 یہاں پر کون ہمارا ہے
 یہاں پر کون ہے حاکم
 کہ سب ہی نے ظلم ڈھایا ہے
 وسیع قربانیوں کے مقتل میں
 اپنے شہیدوں کو پایا ہے
 عجب چروں پہ چرے ہیں
 کہ سب نے روپ دھارا ہے
 حاکم کے رتے پر
 حیوان پھنپھا پایا ہے
 اب کس سے کریں شکوہ؟
 اب کس سے کہیں جا کر؟
 بسھی میں نہاں ہم نے
 فرعون کو پایا ہے
 سوچوں پہ پرے ہیں
 جذبات پہ تالے ہیں
 ہر رات میں پنہاں
 بے نام اجالے ہیں
 ہم پیار کے سوداگر
 کس دیس میں رہ بھٹے
 جس طرف نظر اٹھے
 اپوں کے لاشے ہیں
 ہم کس سے کہیں جا کر
 ہم کس سے کریں شکوہ؟
 یہ دیس انوکھا ہے
 یہ دیس انوکھا ہے

مختاری کی مجبوری

سیدہ نفیس حسن (فلوریڈا)

میں ان آنکھوں کی صدیوں سے اسیر ہوں۔۔۔۔۔ یہ کیسی اسیری ہے۔۔۔۔۔ جس میں زندگی بھی ہے اور موت بھی اور زندگی بھی کیسی زندگی۔۔۔۔۔ ایک عجیب سی مدہوشی۔۔۔۔۔ سرشاری اور سپردگی۔۔۔۔۔ کہیں خوابوں کا دھند لکا ہے اور کہیں طلسماتی حقیقتوں کی تلاش۔۔۔۔۔ میں نے زندگی سے کبھی کوئی تمنا نہیں کی اور مطمئن بھی رہی۔۔۔۔۔ زندگی دھیرے دھیرے رواں دواں ہے۔ سبک ندی کی مانند۔۔۔۔۔ مجھے ہمیشہ سمندروں کے مدد جدر سے خوف و دہشت رہی۔۔۔۔۔ لیکن دل کے سمندر میں۔۔۔۔۔ میرے اندر۔۔۔۔۔ دل میرا دل۔۔۔۔۔ بس یہ سارا معاملہ ظاہر و باطن کا ہے۔ یہ محبتیں بھی انسان کو مار دیتی ہیں۔ دھیرے دھیرے دل کو ایک عجیب سی گداز اور پگھلاؤ بخش دیتی ہیں۔ اور کائنات کے ہر شے پر پیارا آنے لگتا ہے۔ یہ چند لمحوں کی بات نہیں ہوتی۔ وقت اور بہت سادقت گذر جاتا ہے۔ موسم بچتے ہیں۔ ماہ و سال دھند لکوں میں کھو چلے جاتے ہیں۔ تب ایک نئی دنیا کی تسخیر عمل میں آتی ہے۔ اور یہ دل کی دنیا ہم خود ہماتے ہیں۔۔۔۔۔

ہماری اپنی یہ دنیا۔۔۔۔۔ اندر کی دنیا۔۔۔۔۔ باہر کی دنیا سے بالکل مختلف ہوتی ہے۔ بظاہر ان دونوں میں کوئی بھی فرق نہیں ہوتا۔ اور ہم دوہری زندگی بھی بسر نہیں کر رہے ہوتے۔۔۔۔۔ بس کبھی کبھی ایسا ضرور ہوتا ہے کہ اندر کی دنیا کی طوفانی بل چل کا عمل انسان کو باہر سے اُداس کر دیتا ہے۔ اور پھر یہ اُداسی بہت سے سوال کرتی ہے۔ ان سوالوں کے جواب ہوتے ہوئے بھی ہم مطمئن نہیں ہو پاتے۔

کیا اسیری ہے، کیا رہائی ہے۔۔۔۔۔؟؟۔۔۔۔۔

یہ قید بھی خوب ہے اور یہ قید بھی خود ساختہ۔۔۔۔۔ اور یہ خود ساختہ قید میرے خیالات کی سچائی کی قید ہے۔۔۔۔۔ میرے دل کے اندر ان طوفانوں کی ہے جو دل کے سمندر میں بند ہیں اور اس موتی کی تلاش میں سرگرداں ہیں جو ان طوفانوں کو سکون سے آشنا کر دے۔۔۔۔۔ ہم تمنا کا حاصل بہت جلد چاہتے ہیں۔ مگر یہ موتی مشکل سے ملتا ہے۔ یہ نارسائی اور لا حاصل ہی تو ہے جو زمینوں کو آسمان میں پہنچاتا ہے۔۔۔۔۔ یوں چاند اور تارے نگاہوں میں قدر پاتے ہیں۔۔۔۔۔ ورنہ زمین تو قدموں تلے وہی ہے۔ کہ جو ہے۔۔۔۔۔ میں نے چاند تاروں کو قدموں تلے لانے کی بھی تمنا نہیں کی۔۔۔۔۔ میں نے تو حاصل بھی نہیں چاہا۔۔۔۔۔

کان ستارے چھو سکتا ہے، راہ میں سانس اکھڑ جاتی ہے۔۔۔۔۔ سب کچھ اُوپر اور بہت بلند ہی اچھا لگتا ہے!!۔۔۔۔۔

(یہ نارسائی کا رومان بھی خوب ہے)

میرے اندر کی دنیا بہت وسیع ہے اور وقت کا لاقہمائی سلسلہ ہے۔۔۔۔۔ صدیوں کے گہرے اور انٹ نقوش ہیں جو نہ جانے کتنی تہذیبوں کے پروردہ اور یہاں دل کی تہوں میں۔۔۔۔۔ یادوں کے سلسلے ہیں۔۔۔۔۔ کتابیں مٹ کر بھی زندہ رہتی ہیں۔۔۔۔۔ کرجی کرجی جمع کر کے ذہن جوڑا جاتا ہے اور وقت کے موتیوں میں پرو کر ہادوں کے ہار تیار کرتے ہیں۔

یادوں کے سلسلے ہیں جو نونے ہیں اور کبھی جڑتے ہیں۔۔۔۔۔ کبھی ہونٹوں پر مسکراہٹیں بکھرتے ہیں تو کبھی آنکھوں کو خون سے بھر دیتے ہیں۔ اور یہ یادیں مٹ کر بھی دل کے نماں خانوں میں زندہ رہتی ہیں۔ چھوٹی چھوٹی باتیں تہذیب کی چھوٹی چھوٹی کرجیاں۔۔۔۔۔ اور

ارضِ وفا

(طلعت اشارت۔ فلاڈیلیا)

مجھ کو اندیشے لمبے نذر کروں
دور آشوب ہے کیا اس کے سوا نہ کروں
گل نہ ہوں روشنیاں ، سبز رہے ٹھلِ وفا
اس کا دیپ جلاؤں یہ دعا نہ کروں

اس شب تار میں چاند اور ستارے ٹانگوں
یا حدِ فطرتِ انساں تہو بالا کر دوں
عصیت خیز اندھیروں میں گہرے گہرے میرے
کن چراغوں کو جلاؤں کہ اُجالا کر دوں

جب بھی ملتی ہے خبر اک نئے ہنگامے کی
مجھ کو آتا ہے تری صبحِ درخشاں کا خیال
شہرِ دلدار کی گلیوں میں درِ جاناں پر
چاندنی رات کی بھری ہوئی افشاں کا خیال

جب در و بام پہ چنگاریاں گرتی ہیں ترے
جب خبرِ ن کے سو رنگ سماں ملتی رہے
جب بھی ناگفتہ حوادث کوئی دہراتا ہے
خرمن جاں پہ مرے برق تپاں گرتی ہے

یہ تری حد یہ مری حد ، یہ ترا گھر یہ مرا گھر
سنگ در سنگ بنی حرص و ہوا کی دیوار
ایک اک کر کے باپِ وفا بند ہوئے
جا جا نگر نے سوائے اخوت کے مزار

آستینوں میں چھپے سانپوں کے پھن تو دیکھو
لپٹاتے ہیں زباں ، داغِ سخن پختے ہیں
چند سکوں کے عوض عصمتِ جاں پختے ہیں
غیرت ، عزت و ناموسِ وطن پختے ہیں

یہ تفر ، یہ تعصب کے گھنیرے بادل
گھر کے اٹختے ہیں تو پھر آگ ہی برساتے ہیں
جب بھی جذبات کے بارود بھبک اُٹختے ہیں
اپنے ہی دامنِ امید کو جھلساتے ہیں

طوقِ نفرت جو اتر جائے تو ممکن ہے اماں
زنگِ تفریق کو الفت سے اتاریں آؤ
پاسِ ایمان کہ ناموسِ دفاعِ شہیدا
حسنِ تقسیم کو آپس میں نکھاریں آؤ

آؤ انسانیتِ زیت کو لاجد کر دیں
وسعتِ عشق کو محدود نہ کر پائے کوئی
دقتِ سیلاب بھی ہے دورِ سبک گام بھی ہے
اس کی رفتار کو مسدود نہ کر پائے کوئی

نہ علاقہ نہ زبان ہو نہ کوئی فرقہ ہو
بھائی چارہ ہو محبت ہو سبھی کا ایمان
ساتھیو کچھ تو کرو خونِ شہیداں بے باقی
ایکٹا مثلِ حرم کیوں نہ ہو اپنی پہچان

آنکھ کھولیں مرے بچے تو بھرا گھر دیکھیں
آستیں پہ نہ ہو اپنی کسی اپنے ہی کا خون
ہو ترا نامِ سماعت کے لئے حسنِ غزل
مطلعِ صبحِ چمن جب بھی ترا ذکر کروں

دل کی گمراہی سے مانگی یہ دعا نذر کروں
اور کیا ارضِ وفا ! تجھ کو بھلا نظر کروں

منطقی انجام

- کلیل صدیقی -

۱۳ دسمبر ۲۰۰۳ء ---- ایک تاریخ ---- ایک علامت بن گئی ---- جب خوف و دہشت کے باب کا خاتمہ ہوا ---- دنیا بھر کے ذرائعِ بلاغ نے Breaking News کے حوالے سے یہ خبریں نشر کیں ---- صدام حسین گرفتار ہو گئے ----

ایک تاریخ ساز دن ---- ” صدام حسین اپنے آبائی گاؤں تکریت سے گرفتار ----



صدام حکومت کے خاتمے کے بعد جہاں عراق کے مختلف شہروں میں بڑے بڑے واقعات نے عراقی عوام کو خوف زدہ کر رکھا تھا وہیں سابق حکمران جماعت ” Baath Party ” بحث پارٹی اور اس کے سربراہ معزول صدر صدام حسین کے دوبارہ مسدود اقتدار سنبھالنے کا خوف اور ڈر عراقی عوام کے لئے ایک ایسے بھیانک خواب کی مانند تھا کہ جو کبھی بھی اور کسی بھی لمحے حقیقت کا روپ لے سکتا تھا۔

” Operation Iraqi Freedom ” کے نام سے جاری امریکی کارروائی اور اس کارروائی کے دوران صدام حکومت کے

دھڑن تختے نے جہاں وقتی طور پر عراق کی گلیوں اور محلوں میں جشن کا سماں پیدا کر دیا تھا وہیں برسوں سے صدام حکومت کے ظلم و ستم کے شکار عراقی ذہنی طور پر انجانے ڈر اور خوف کا شکار تھے۔

صدام کی آمریت نے عراقی عوام کو اس حد تک نفسیاتی طور پر اپنا غلام بنا لیا تھا کہ وہ اس حکومت کے خاتمے کے بعد بھی اس کے ظلم و ستم اور ناانصافی کے خلاف لب کشائی کرنے



ماں

(حادثہ شہی)

ماں -- کتنا وقت بیت گیا ہے -- اک اک بلی ایسے گزارا ہے -- جیسے صدیاں -- کونسا ایسا لمحہ ہے جو تیری یاد کے بغیر جیتا ہو -- ہر خوشی -- ہر غم -- میں نے تجھے ایسے یاد کیا ہے -- جیسے خشک -- بجز زمین -- آسمان سے مینہ برسنے کی -- فریاد کرتی ہے -- جیسے مرجھائی ہوئی کلیاں -- اپنی کھوئی ہوئی خوبصورتی کو یاد کرتی ہے -- جب جب ہنسا ہوں -- تب تب تیری مسکراہٹ یاد آتی ہے -- جب جب رویا ہوں -- تیری صحبت -- تیری ممتا -- تیری آغوش -- اک دلاسا بن کر -- میرے آنسو پونچھتی رہی ہے -- اور مجھے ممتا -- استقامت -- اور منزل پر پہنچ جانے کا انعام -- اور اس کو پالنے کا یقین دیتی رہی ہے -- اس سفر میں -- جب بھی -- کبھی -- کبھی بھی سستانے بیٹھا ہوں -- تیری آنکھوں کی چمک -- اور تجھ سے قریب رہنے کی آرزو -- اک منزل بن کر -- میرے سامنے -- ایسا سامان باندھتی ہے -- کہ جس نے ہمیشہ -- میری تھکاوٹ -- میرے سارے دکھ -- ساری تکلیفیں دور کی ہیں !!!

ماں !!! -- تجھے یاد ہے نا -- جب میں نے جوانی کی دہلیز پر قدم رکھا -- تو -- مجھ سے -- کیسی -- دانشوروں جیسی باتیں کرتی تھی -- کیسے مجھے -- سچ کی تلقین کرتی تھی -- مجھے -- سزا دیا -- باطل کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر -- بات کرنے کا حوصلہ دیتی تھی -- کیسے -- مجھ جیسے شکست خوردہ -- کم ممتا انسان کو -- سیدھی کر سے -- کھڑا کرتی تھی -- اور سچائی کی راہ پر -- گامزن کرتی تھی -- اے ماں !!! آج تک جتنا بھی چلا ہوں -- تو بس تیرے ہی قدموں سے -- کھڑا ہوں تو تیری ممتا سے -- دیکھتا ہوں تو تیری نظروں سے -- ہوتا ہوں -- تو الفاظ تیرے ہیں -- سوچتا ہوں تو سوچ تیری ہے -- بس -- میں تو اک جسم ہوں اور میری روح -- بس تو ہی ہے !!!

ماں !!! تجھے یاد ہے نا -- کہ جب تو نے آنسوؤں سے مہری -- آنکھوں کے ساتھ -- دل پر ہاتھ رکھ کر -- مجھے الوداع کیا تھا -- میری ہی خاطر -- خود کو مجھ سے جدا کیا تھا -- سات سمندر پار -- آج بھی -- تیرا -- وہ آنسوؤں سے مہر چہرہ -- میری نظروں کے سامنے ہے -- تجھ سے دور رہ کر --

میں نے بھی بہت -- زخم کھائے ہیں -- کسی پل -- چین کی -- اک کروٹ بھی نہیں لی ہے -- مصائب کے کیسے کیسے دریا عبور کئے ہیں -- غیروں کی دشمنیاں -- اپنوں کی بدلوئیں -- پیاروں کو کھویا -- کھلے آسمانوں کے نیچے سویا -- کبھی تو دن دن بھر -- کچھ نہ کھایا -- بس تیری ہی یاد کو -- تیری ہی باتوں کو -- تیری ہی نصیحتوں کو -- دل لگایا -- لیکن پھر بھی ماں -- میں جانتا ہوں -- ان تمام پریشانیوں -- مصیبتوں -- اور آلام کے باوجود -- میرا دکھ -- تیرے دکھ کے سامنے -- کچھ بھی تو نہیں -- جو کرب تو نے سہا ہے -- جو کرب تو سہا رہی ہے -- میرا دکھ اسکا عمر عشیر بھی نہیں -- بھلا -- ماں بھی کبھی -- اپنی اولاد کو دور کر کے -- کبھی سکھ سے رہ پائی ہے ؟ -- تیرا ہر آنسو -- میرے دل پر پڑا ہے -- تیری ہر فریاد -- میرے کانوں میں گونجی ہے -- ماں -- میری خاطر -- میرے مستقبل کی خاطر -- تو نے غیروں سے جو سنا -- جو سلوک برداشت کیا -- جی تو چاہتا ہے -- ہر وہ زبان کھینچ لوں -- جو تیرے خلاف بولی -- ہر وہ ہاتھ کاٹ دوں -- جو تیری عظمت کی طرف بڑھے -- ہر وہ پیر توڑ ڈالوں -- جو جو تجھے -- نقصان پہنچانے کے لئے اٹھے -- ہر وہ سر -- قلم کر دوں -- جو تیرے سامنے -- تیری بوائی کے سامنے -- غرور بن کر اٹھا -- لیکن !!! لیکن کیا کروں ماں -- مجبور ہوں -- تیری ان آنسوؤں کے آگے -- جو مجھے تکلیف پہنچانے کے خیال سے -- پھلک جاتے ہیں -- مجبور ہوں -- کہ کہیں -- میرا کوئی -- جذباتی -- کوئی غلط فیصلہ -- تجھے نقصان نہ پہنچا دے -- کہیں تکلیف -- تیری پریشانی کا باعث نہ ہو -- !!!

ماں !!! -- اکثر -- یہ 'دوری' سہی نہیں جاتی -- تیری ممتا سے دور رہنے کا یہ کرب -- ناقابل برداشت ہے -- اور نہ جانے کب تک -- یہ کرب سستا ہے -- جدائی کے اس عالم -- میں رہنا ہے -- بس اک یقین ہے -- تیری صحبت پر -- تیری ہر اس بات پر -- جو تو نے مجھے سکھائی -- مجھے پڑھائی -- یقین ہے -- اس منزل پر پہنچنے کا -- کہ جس کا راستہ -- تو نے دکھایا -- یقین ہے اس کو پالنے کا -- کہ جس کا خاکہ -- جس کا تصور -- تو نے دیا -- اور ان سب کے ساتھ ساتھ -- سب سے ماورا -- یقین اس بات کا -- کہ میں تجھ سے پھر ملوں گا -- تیری آغوش میں -- پھر سے پنہا لوں گا -- تیرے پیاروں کے ساتھ -- اپنے پیاروں کے ساتھ -- !!! میری تو منزل بھی تو ہی ہے -- ابتداء و انتہا بھی تو ہی ہے -- یقین ہے تو پھر -- دیر کیسی -- بس اب کچھ دیر نہیں -- کہ تیری آغوش -- تیری گود -- اور میرا سر -- !!! ماں -- اے میری ماں -- میری تحریک !!!!!!

سے ہر ممکن اجتناب برت رہے تھے۔

ظلم و تعدد اور کھلی عام جیسے ہتھکنڈوں نے صدام اور اس کے حواریوں کو جہاں اپنی من مانی کرنے کی آزادی فراہم کی وہیں معصوم عراقی عوام کی جسمانی اور ذہنی دونوں ہی طرح کی غلامی کو بھی یقینی بنایا۔ تیل کے وسائل سے مالا مال عراق کے عوام بھجلی کئی دہائیوں سے غربت، افلاس اور جہالت جیسے بیادری مسائل کا شکار تھے۔ جہاں عراقی شہروں اور قصبوں میں صدام حسین کے قد آور مجتہد آرٹ کا اعلیٰ نمونہ پیش کر رہے تھے وہیں مایوسی، محرومی اور حسرت و یاس کی تصویر بنے عراقی عوام دنیا بھر میں صدام حکومت کے مظالم کو چیخ کر پیش کر رہے تھے۔ اتحادیوں کے عراق پر کنٹرول حاصل کرنے کے بعد جہاں صدام حسین اور اس کے حواریوں نے راہ فرار اختیار کی وہیں یہ افواہیں بھی گردش کرنے لگیں کہ صدام حسین اتحادی فوجوں پر حملوں کے لئے پیش بندی کر رہے ہیں اور اپنے ساتھیوں کو پھر سے منظم کر رہے ہیں۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان افواہوں نے عملی شکل اختیار کی اور پھر جلد ہی خود عسکری حملوں نے عراق کی فضاء اور ماحول کو خونی کر دیا۔



گزرتے مہینوں کے ساتھ جہاں بعث پارٹی (Baath Party) کے اعلیٰ عہدیدار اتحادیوں کے ہاتھوں گرفتار ہوتے گئے وہیں صدام کی گرفتاری کے لئے جاری مہم کو مزید تیز کرنے کے لئے بین الاقوامی دباؤ میں اضافہ بھی ہوتا گیا۔

صدام عراق میں موجود ہیں یا بیرون

ملک فرار ہو چکے ہیں؟ عراق میں منظم ہونے والی "Resistance Force" کو صدام کی پشت پناہی حاصل ہے یا نہیں؟ صدام زندہ ہیں یا مردہ؟۔ ان ہی جیسے دیگر سوالات طویل عرصے تک بین الاقوامی ذرائع ابلاغ میں پوری شدت کے ساتھ زیر بحث رہے اور بالآخر ۱۳ دسمبر ۲۰۰۳ء کی صبح کئی ماہ چلنے والی یہ بحث اپنے منطقی انجام کو پہنچی اور اس کے ساتھ ہی عراق پر مسلط خوف و آمریت کا باب بھی -----